حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا حکم میں وہ جملہ اہم احکام موجود ہیں جو یہاں ہماری مراد ہیں :

اوّل یہ کہ مسلمان حکومت کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ قلیل المال اور کم آمدنی والے افرادِ اُمّت کا خاص طور پر خیال رکھے اور انہیں ایسے مواقع مہیا کرے کہ وہ کام کر کے کمائی کریں اور دولتمند ہو جائیں۔ اگرچہ اس مقصد کے لیے اُسے اغنیاء اور کثیر المال افراد پر عرصۂ ترقی تنگ کرنا پڑے اور انہیں حصولِ دولت کے بعض مواقع اور کسب و کار کے بعض وسائل سے محروم کرنا پڑے اور اُن کی آمدنی میں اضافہ و ترقی کو روکنا پڑے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے واضح ہے جو آپ نے چراگاہ کے عامل سے فرمایا تھا کہ "تھوڑے اونٹوں اور بکریوں والوں کو چراگاہ میں داخلے کی اجازت دو اور ابنِ عفانؓ اور ابنِ عوفؓ کے چوپاؤں کو رہنے دو"

دوم یہ کہ اسلامی حکومت کے حدود میں بسنے والے ہر شخص کا یہ حق ہے کہ اگر اس کا ذریعۂ آمدنی تباہ ہو جائے اور حصولِ رزق کا کوئی ذریعہ نہ رہے تو وہ حاکمِ وقت کے رُوبرو اپنے اور اپنے بچوں کے حق کے لیے دہائی دے اور حکومتِ اسلامی کے خزانۂ عامرہ سے مدد دیئے جانے کا مطالبہ کرے۔ اور حاکمِ وقت یا حکومت کے متعلقہ اہل کار کو اس کا مطالبہ پورا کیے بغیر اور اس کی اور اس کے کنبے کی ضروریات پورا کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "اور یہ مسکین، اگر اس کے مال مویشی ہلاک ہو گئے تو وہ اپنے بچوں کو ساتھ لے کر میرے پاس آکر دہائی دے گا کہ اے امیر المومنین! کیا میں ان بچوں کو چھوڑ دوں؟

سوم یہ کہ اس سلسلے میں صحیح حکمتِ عملی یہ ہے کہ فقراء و مساکین میں سے جو لوگ کام کرنے کی قدرت رکھتے ہوں انہیں کوئی کام مہیا کیا جائے اور کم آمدنی والے افرادِ امّت کے ذرائع آمدنی کو ترقی دی جائے تاکہ فقراء اور کم آمدنی والے اپنی کوشش اور محنت کے سبب حکومت کی امداد و اعانت سے مستغنی ہو سکیں اور بیت المال پر بوجھ نہ بنیں۔ یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے واضح ہوتی ہے کہ "گھانس پھونس مہیا کرنا میرے لیے سیم و زر مہیا کرنے سے آسان ہے"

# "حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت"

## "البلاغ" کے خصوصی نمبر پر تبصرہ

(از ملک غلام علی صاحب)

ناظرینِ "ترجمان" اس بات سے آگاہ ہیں کہ میں نے "البلاغ" کے ایک سلسلۂ مضامین "حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت" کا جواب سپردِ قلم کیا تھا جس کی آخری قسط ربیع الاوّل ۱۳۹۰ھ (جون ۱۹۷۰ء) کے ترجمان القرآن میں شائع ہوئی تھی۔ آٹھ ماہ گزر چکنے کے بعد اب "البلاغ" کا پھر ایک ۸۰ صفحات کا خصوصی نمبر نکلا ہے جو میرے مضمون کی تردید کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ اس میں طنز و تعریض اور اکثر و بیشتر سابقہ مزعومات و استدلالات کی تکرار کے ماسوا کچھ نہیں ہے۔ میرے بیان کردہ شواہد و دلائل اور میرے اٹھائے ہوئے سوالات سے شاذ و نادر ہی اعتناء کیا گیا ہے۔ تاہم میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس تعاقب کا بھی نوٹس لوں اور جن غلطیوں اور مغالطوں پر یہ مشتمل ہے انہیں پھر ایک بار واضح کر دوں۔

**تمہیدی کلمات** | مگر اصل بحث سے قبل چند تمہیدی کلمات ضروری ہیں۔ مولانا مودودی کی تصنیف "خلافت و ملوکیت" کا مواد "ترجمان القرآن" میں چھ سال پہلے چھپنا شروع ہوا تھا۔ اسی وقت سے بعض حضرات کی طرف سے اس پر ردّ و کد اور سبّ و شتم کا آغاز ہو گیا تھا، لیکن ہم نے اس پورے عرصے میں کبھی باقاعدہ حریفِ مناظرہ بننے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ میں ذاتی طور پر تمام تنقیدی اور مخالفانہ تحریروں کا بغور مطالعہ کرتا رہا اور جب مدیر "البلاغ" کے بقول یہ گرماگرمی کچھ دھیمی پڑی تو میں نے خیال کیا کہ اب مولانا مودودی کو ناکردہ گناہ کی سزا کافی مل چکی ہے اور تصویر کا دوسرا رُخ پوری طرح سامنے آ چکا ہے، اس لیے غالباً اب یہ مہم ختم ہو جائے گی لیکن ۱۹۶۸ء کے اواخر میں مجھے کراچی، سرحد اور کچھ دوسرے مقامات کے بعض رفقاء کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ

جو علمائے کرام جماعت اسلامی کے خلاف سرگرم رہتے ہیں، وہ ان دنوں بہت مسرور ہیں، ——— کیونکہ ان کے علم میں یہ بات آتی ہے کہ عنقریب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے صاحبزادے کی طرف سے ایک ایسی چیز منظر عام پر آنے والی ہے جو مولانا مودودی کا سارا بھرم کھول کر رکھ دے گی۔ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے بعض دوسرے مخالفین کے اعتراضات اپنے سوقیانہ پن اور فحش کلامی کے باعث مؤثر نہیں ہوتے، لیکن اب جو تنقید آرہی ہے، وہ بڑی سنجیدہ و مدلل ہے۔

اس کے چند ماہ بعد پہلے "البلاغ" میں اشتہار آیا، پھر وہ موعودہ سلسلہ مضامین جاری ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی یہ "بینات" اور بعض دوسرے پرچوں میں جلی عنوانات کے تحت نقل ہونا شروع ہوگیا، حتیٰ کہ ہندوستان میں جمعیت علمائے ہند کے ترجمان "الجمعیت" میں بھی اس کی قسطیں چھپنا شروع ہوگئیں۔ نتیجۃً پرانی مُردہ مہم کو نئی زندگی مل گئی اور ملک بھر بلکہ بیرونِ ملک سے یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ اس تنقید و تردید کی حقیقت واضح کی جائے۔ "خلافت و ملوکیت" کی جن عبارتوں کو "البلاغ" میں ہدف بنایا گیا ہے، وہ تیرہ یا چودہ صفحات سے زاید نہیں ہیں، لیکن "البلاغ" نے انہیں آٹھ ماہ تک موضوعِ بحث بنایا ہے۔ آغاز میں طرزِ بحث مقابلۃً گوارا اور بظاہر معقول تھا لیکن بتدریج اس میں جارحیت کا رنگ نمایاں ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ صریح مغالطہ انگیزی سے بھی اجتناب نہ کیا گیا۔ آخر کار دو ڈھائی ماہ توقف کے بعد میں نے مجبوراً قلم اٹھایا اور ہر الزام و اعتراض کا شافی جواب دے دیا۔ مگر افسوس کہ "البلاغ" نے کوئی اثر قبول نہ کیا اور اپنی باتوں کو اس طرح دہرا دیا اور میری ہر بات کو اس طرح نظر انداز کر دیا گویا کہ سرے سے کوئی جواب دیا ہی نہیں گیا۔ اس لیے میرے لیے اب یہ ناگزیر ہے کہ میں "البلاغ" کے تازہ خاص نمبر پر پھر ایک مرتبہ تبصرہ کروں۔

البلاغ کے اس تازہ پرچے کے آغاز میں جو شکایت خاص طور پر کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ میں نے "براہِ راست مناظرہ کے اس اسٹیج سے گفتگو شروع کر دی جہاں مخالف پر طعن و تشنیع کرنے، فقرے کسنے اور پھبتیے اڑانے کے بغیر کوئی بات نہیں ہوتی اور جہاں صرف اس کو ہی نہیں، اس کے اکابر کو اور اس کے مدارس کو بھی مطعون کرنا زورِ بیان کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔" پھر فرماتے ہیں "اگر کسی کو طنز و تعریض کا ایسا ہی ذوق ہو تو پھر انشاء کی یہ صنف تھوڑا سا ریاض چاہتی ہے، اس کی نزاکتوں پر قابو پانے کے لیے محنت کی ضرورت ہے۔"

مَیں اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ مَیں نہ اہلِ زبان میں سے ہوں، نہ مجھے انشا پردازی و عبارت آرائی کا سلیقہ ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ کوئی نا ملائم یا چُبھتا ہوا جملہ مجھ سے صادر ہو گیا ہو۔ اگر ایسا ہے تو میں اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرا خیال یہ بھی ہے کہ فنِ انشاء کی جس صنفِ لطیف میں امامت کا دعویٰ مدیر "البلاغ" نے فرمایا ہے، بلاشبہ اس کے نادر نمونے ان کی سابقہ اور حالیہ تنقید میں جا بجا موجود ہیں۔ میں انشاء اللہ آگے چل کر ان معصوم طنزیات کے بعض ٹکڑے پیش بھی کروں گا تاکہ جو حضرات اس فن میں سبکدست ہونا چاہیں، وہ ان سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔

اکابر پر طعن | پھر یہ عثمانی صاحب کے اکابر کو مطعون کرنے کا جو الزام مجھ پر عائد کیا گیا ہے، معلوم نہیں اس کا مأخذ کیا ہے؟ تاہم بالفرض اگر مجھ سے یہ قصور ہوا ہو، تو اس پر طلبِ عفو کرتے ہوئے کیا مَیں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ دوسروں کے بھی کچھ اکابر یا بزرگ ہو سکتے ہیں یا سارے اکابر آپ ہی کے حصے میں آئے ہیں؟ مَیں سمجھتا ہوں کہ ہم نے ہمیشہ فرقِ مراتب کو ملحوظ رکھا ہے اور دوسروں کے اکابر کے منہ آنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ مثال کے طور پر مجھ جیسا کم سواد شخص جس نے محترم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے بصیرت افروز فتاویٰ سے استفادہ کیا ہے، اُسے اُن کے بعض فتوے کتاب و سنت اور مسلکِ حنفی سے متطابق معلوم نہیں ہوئے لیکن مَیں نے ان کے خلاف علانیہ لب کشائی کی جرأت آج تک نہیں کی کیونکہ یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی لیکن دوسری طرف اطفالِ مکتب بھی اُٹھ کر بے تکلف مولانا مودودی پر پے درپے شروع کر دیتے ہیں جن کے مطالعہ و تصنیف کی عمر اِن اطفال کی عمر سے بہت زیادہ ہے۔ اور پھر غضب یہ ہے کہ اس تعدّی کے بعد تعلّی سے بھی کام لیتے ہیں اور اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی، ملک و بیرونِ ملک سے ہمارے پاس خطوط و پیغامات کا تانتا بندھا رہا۔

جو لوگ مولانا مودودی کا لحاظ نہیں کر سکتے وہ اگر مجھے بھی معاف نہ کریں تو اس میں تعجّب یا شکایت کی کوئی بات نہیں۔ تاہم یہاں میں ایک مثال پیش کر کے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری کن باتوں کو یہ طنز و تعریض پر محمول کر کے بُرا مان رہے ہیں۔ میری عمر اب ترپن ۵۳ برس کے لگ بھگ ہے اور میری اولاد بھی غالباً اب مدیر "البلاغ" کی ہم سن ہو کر صاحبِ اولاد ہو چکی ہے۔ مجھے معلوم ہُوا ہے کہ مدیر "البلاغ" کی عمر شاید پچیس تیس

برس کے قریب ہے اور ان کی شادی بھی اُسی دوران میں ہوئی ہے جب وہ "خلافت و ملوکیت" پر تنقید کر رہے تھے۔ اس کے باوجود میں نے انہیں جا بجا مدیرِ "البلاغ" مولانا محمد تقی صاحب عثمانی کہہ کر ان کا ذکر کیا ہے۔ مجھے اگرچہ اس میں کچھ تکلف سا محسوس ہوتا تھا لیکن میرا گمان یہ ہے کہ انہوں نے اس اندازِ خطاب کو بطیبِ خاطر قبول فرمایا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ چوک ہو گئی کہ اپنی سادگی و صاف دلی کی بنا پر غالباً کسی ایک ہی جگہ میری نوکِ قلم سے "عزیزم محمد تقی صاحب عثمانی" کے الفاظ بے ساختہ نکل گئے۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ وہ علم و عقل میں مجھ سے فائق سہی، مگر سال و سن کے اعتبار سے چونکہ میں ان سے کم از کم بیس بائیس برس بڑا ہوں، اس لیے اگر نیک نیتی کے ساتھ میں انہیں سلّمہ، یا اس طرح کے کسی لفظ سے بھی یاد کر بیٹھا، تو اس میں حاشا و کلّا تحقیر و تعریض کا کوئی قرینہ نہ ہوگا، مگر معلوم ہوا کہ "یہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے"۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے بطورِ خاص میرا یہ جملہ نقل کیا ہے کہ "میں عزیزم محمد تقی صاحب عثمانی سے کہتا ہوں . . ." پھر اس کے جواب میں فرمایا ہے "میرے "بزرگوار محترم" مطمئن ہیں کہ اپنے اس "مشفقانہ" مشورے کے بعد انہوں نے میرے اعتراض کا جواب دے دیا۔ اب اگر کوئی "بے ادب" یہ سوال کرنے لگے . . . تو یہ اس کی صریح نالائقی ہے کہ وہ بزرگوں کی بات کیوں بے چون و چرا نہیں مانتا"۔ (اس عبارت میں "واوین" کے نشانات بھی عثمانی صاحب ہی کے لگائے ہوئے ہیں اور "بزرگوار" کا تمسخر آمیز خطاب بھی مجھے اسی ایک مقام پر عطا کرنا ضروری سمجھا ہے)۔

مجھے تو نہ بزرگوار و محترم بننے یا کہلوانے کا شوق ہے اور نہ کسی کو عزیزم کہنے یا ادب سکھانے پر اصرار ہے لیکن یہ نتیجہ اخذ کرنے میں تو میں بالکل حق بجانب ہوں کہ ایک طرف تو ان حلقوں کے اصاغر بھی دوسروں کے اکابر کے منہ آتے ہیں، اور دوسری طرف ان کا حال یہ ہے کہ ان کی عمر سے متجاوز بھی کوئی انسان بھولے سے عزیزم کہہ بیٹھے تو یہ اسے اپنی شان میں گستاخی خیال کرتے ہیں اور اس وقت جو پہلا سبق وہ دوسروں کو پڑھا رہے تھے، اُسے خود بھول جاتے ہیں کہ "طنز کی گولی خود اپنے اوپر بھی چل جاتی ہے"۔ اس طرح کے صاحبزادگان جو ابھی سے بزرگی اور بڑائی کے خواب دیکھنے لگے ہیں، انہیں سوائے اس کے اور کیا کہا جاتے کہ "کے آمدی وکے پیر شدی"؟

**حوالے میں تبدیلی کا اعتراض** بہرکیف اب میں نفسِ بحث کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور مولانا عثمانی صاحب نے جن اعتراضات کو دُہرایا ہے، ان کا دوبارہ جائزہ لیتا ہوں۔ توریث مسلم من الکافر کے مسئلے پر جو پانچ سطور

مولانا مودودی نے لکھی تھیں، انہیں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "میں نے اس عبارت پر دو اعتراضات کیے تھے، پہلا یہ کہ مولانا مودودی نے آخری جملے (حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے آکر اس بدعت کو ختم کیا) میں امام زہریؒ کی طرف یہ بات منسوب کی ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کے اس مسلک کو بدعت قرار دیا ہے، حالانکہ البدایہ و النہایہ میں امام زہریؒ کا اصل عربی جملہ یہ ہے کہ راجع السنۃ الاولیٰ۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے پہلی سُنّت کو لوٹا دیا۔ میرا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے سُنّتِ اُولیٰ کے لفظ کو بدعت سے کیوں بدلا۔ اگر مولانا خود حضرت معاویہؓ کے اس مسلک کو بدعت سمجھتے ہیں تو وہ اسے بدعت فرمائیں لیکن امام زہری کی طرف وہ بات کیوں منسوب کی گئی؟ ملک غلام علی صاحب نے میرے اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا۔" جواب اس کا یہ ہے کہ میرے نزدیک یہ سرے سے کوئی اعتراض ہی نہ تھا جسے اُٹھانے اور رفع کرنے میں وقت ضائع کیا جاتا۔ لیکن اب جبکہ مولانا محمد تقی صاحب نے اسی سے بسم اللہ کی ہے اور یہ بات بھی میرے علم میں آئی ہے کہ بعض دوسرے حضرات بھی ایک طرف خلافت و ملوکیت کی کوئی عبارت رکھتے ہیں، دوسری طرف حاشیے کے حوالہ جات میں سے کوئی ایک کتاب اُٹھا کر کہتے ہیں کہ اس میں وہ عبارت بالفاظہا موجود نہیں ہے بلکہ دونوں میں لفظی و معنوی تفاوت ہے، پھر اس کے بعد زور سے کہا جاتا ہے کہ نہ صرف یہ حوالہ بلکہ دوسرے سارے حوالے نقل کرنے میں بھی غلطی کی گئی ہے، میں اس نوعیت کے سارے اعتراضات کی حقیقت واضح کیے دیتا ہوں۔

بات فی الاصل یہ ہے کہ ایک مصنّف جب کسی دوسرے کی کتاب کا حوالہ دیتا ہے تو اس کے بالعموم دو طریقے ہوتے ہیں ——— ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ناقل اصل کتاب کا پُورا حوالہ اس کے اپنے الفاظ میں من و عن دیتا ہے۔ اس صورت میں وہ ایک ہی مُصنّف کی ایک ہی کتاب کے ایک ہی مقام کا متعیّن حوالہ دیتا ہے اور ساتھ کوئی دوسرا حوالہ شامل نہیں کرتا۔ ایسی حالت میں عام طور پر نقل کردہ عبارت یا اُس کا ترجمہ بالکل الگ ممیّز کر کے دیا جاتا ہے اور اس کے لیے منقول عبارت حوض میں خفی قلم سے واوین کے ساتھ درج کی جاتی ہے۔ اس طرح کا جو اقتباس دیا جاتا ہے اس میں نقل کا بالکل مطابقِ اصل ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے اور کوئی کمی بیشی یا حذف و اضافہ ہو تو اسے ناقابلِ جواز خیال کیا جاتا ہے۔ دوسرا طریقہ اخذ و اقتباس کا یہ ہے کہ ایک مُصنّف ایک سے زاید مآخذ کا حوالہ دے کر ماخوذ مواد کو اپنی عبارت کا ایک جزء

بنا کر پیش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں مأخذ کا مکمل حوالہ بجنسہٖ اصل الفاظ میں نقل کرنا نہ ضروری ہوتا ہے، نہ ممکن۔ اسی لیے اخذ کردہ حوالے کو قطعی طور پر علیحدہ و ممیز کرنے کے لیے حوض یا داوین وغیرہ کی مذکورہ بالا علامات دانستہ طور پر استعمال نہیں ہوتیں۔ اس شکل میں مُقتبس اور اخذ کرنے والے کے لیے یہ تو ضروری ہوتا ہے کہ وہ اصل مرجع کے باب، صفحہ وغیرہ کی نشان دہی کرے، لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ اصل عبارت کا لفظ بلفظ اعادہ کرے اور اس میں ادنیٰ تغیر بھی نہ ہونے پائے۔ بلکہ یہ کافی ہوتا ہے کہ اصل مفہوم و مضمون کو فی الجملہ ادا کر دیا جائے۔ یہ بالمعنیٰ ترجمانی اس حالت میں اور بھی ناگزیر ہو جاتی ہے جبکہ ایک سے زاید کتابوں کا حوالہ دینا مقصود ہو۔ وہاں اگر ہر کتاب کا ایک ایک ٹکڑا یا اس کا ترجمہ الگ الگ درج کیا جانے لگے تو یہ ایک ایسی لاطائل تکرار ہوگی جو لکھنے والے کو تھکا دے گی اور پڑھنے والے اکتا جائیں گے۔ اس لیے جہاں ایک سے زیادہ مراجع کا حوالہ دے کر بات کی جاتی ہے وہاں لکھنے والا متقارب المعنیٰ عبارتوں میں سے ایک مشترک روایت و حکایت (VERSION) اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ یہ تالیف و تصنیف کا ایک جانا پہچانا اور معروف اسلوب ہے جس سے ہر لکھا پڑھا کتاب بین آشنا ہے۔ ہر حوالے کا بلا کم و کاست لفظی اعادہ تو اسی حال میں ممکن ہے جب کہ ہر سابق مصنف نے بعینہٖ ایک ہی بات لکھی ہو۔ لیکن ایسا مکمل لفظی و معنوی توارد تو محالات میں سے ہے، حتیٰ کہ ایک ہی مصنف ایک ہی کتاب میں اگر ایک خیال و مضمون کو دو بار بیان کرتا ہے، تب بھی الفاظ مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال یہی حافظ ابن کثیر اور ان کی کتاب "البدایہ" ہے جس کے دو حوالے مولانا مودودی نے مسئلہ زیر بحث میں دیئے ہیں اور جنھیں غلط ملط کر کے مدیر "البلاغ" نے بدعت و سنت اور پھر سُنّۃ اُولیٰ اور سنۃ اُخریٰ کی بحث پیدا کی ہے۔

مولانا محترم نے البدایہ والنہایہ ج ۸، ص ۱۳۹ اور جلد ۹ ص ۲۳۲ کے دو حوالے دیے ہیں۔ مدیر "البلاغ" نے اپنی تازہ بحث میں پہلے البدایہ ج ۹ ص ۲۳۲ کا حوالہ دیا ہے مگر پوری عبارت نقل نہیں کی۔ یہ عبارت اور اس کا ترجمہ انہوں نے محرم ۱۳۸۹ھ کے البلاغ میں درج کیا تھا جسے میں انہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں:

"امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے اربعہ کے عہد میں نہ مسلمان کافر کا وارث ہوتا تھا، نہ کافر مسلمان کا۔ پھر جب معاویہؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے مسلمان کو کافر کا

وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث نہ بنایا۔ ان کے بعد خلفاء نے بھی یہی معمول رکھا۔ پھر جب عمرؒ بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے پہلی سُنّت کو لوٹا دیا اور یزید بن عبدالملک نے بھی ان کی اتباع کی۔ پھر جب ہشام آیا تو اس نے خلفاء کی سُنّت پر عمل کیا یعنی مسلمان کو کافر کا وارث قرار دے دیا۔"

دوسرا مقام جس کا حوالہ خلافت وملوکیت میں دیا گیا ہے وہ البدایہ ج ۸، ص ۱۳۹ کا ہے۔ اس کی پُوری عبارت "البلاغ" کے تازہ شمارے میں توریث کی بحث میں تو نقل نہیں کی گئی ہے، البتہ آگے چل کر رسالے کے صفحہ ۸۰ پر جہاں ہماری غلطیاں پکڑنے کے شوق میں مولانا عثمانی صاحب نے اپنی عربی دانی و حدیث دانی کا رعب جمانے کی کوشش کی ہے، وہاں اس عبارت کو بھی مع ترجمہ دے دیا ہے اور وہ یہ ہے:

"ابوالیمان شعیب سے اور وہ زہری سے روایت کرتے ہیں کہ سُنّت یہ چلی آتی تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہو گا نہ مسلمان کافر کا۔ یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیز آئے تو انہوں نے پہلی سنت کو لوٹا دیا۔ پھر ہشام نے اس فیصلے کو لوٹا دیا جو حضرت معاویہؓ اور ان کے بعد کے بنو امیہ نے کیا تھا۔"

"پہلی اور دوسری سُنّت" اس ترجمے کے آخر میں ایک ٹکڑا جو قال الزھری سے شروع ہوتا ہے، وہ میں نے اس لیے یہاں حذف کر دیا ہے کہ وہ مسئلہ توریث سے غیر متعلق ہے اور اس پر مفصّل بحث الگ ہو گی۔ ترجمے کے شروع کا جو حصّہ میں نے دیا ہے، اس کے متعلق پہلی بات جو مجھے کہنی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ترجمہ بالکل غلط ہے اور اس میں مدیر البلاغ نے اسی گناہ کا ارتکاب کیا ہے جس کا الزام وہ دوسروں کو دیتے ہیں حالانکہ یہاں انہوں نے ایک ہی متعیّن حوالہ دیا ہے اور اس کا متن بھی ساتھ موجود ہے۔ اصل عربی عبارت یہ ہے: وقال ابوالیمان عن شعیب عن الزھری: مضت السنة ان لا یرث الکافر المسلم ولا المسلم الکافر واول من ورث المسلم من الکافر معاویة وقضی بذالك بنوامیة بعده حتی کان عمر بن العزیز فراجع السنة واعاد ھشام ما قضی به معاویة وبنوامیة من بعده۔ اب اس عربی متن کا ان کے اوپر والے ترجمے سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے خط کشیدہ حصے کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے جو یہ ہونا

چاہیے تھا کہ "پہلے پہل جنہوں نے مسلمان کو کافر کا وارث بنایا، وہ معاویہؓ ہیں" پھر دوسرے خط کشیدہ جملے فراجع السنة کا ترجمہ انہوں نے یہ کیا ہے کہ " انہوں نے (یعنی حضرت ابن عبدالعزیز نے) پہلی سُنّت کو لوٹا دیا" حالانکہ اس میں صرف سُنّت کا لفظ ہے، پہلی سُنّت کا لفظ نہیں ہے۔ اب مولانا مودودی اگر متعدد حوالوں کا ایک مشترک خلاصہ یا مفہوم بیان کرتے ہیں تو ان سے تو یہ مطالبہ ہے کہ ان کا ہر ہر لفظ ہر حوالے کا تحت اللفظ ترجمہ ہو، لیکن آپ ایک ہی حوالے کا لفظی ترجمہ کریں تو اس میں حذف و تصرّف درست ہے!

ممکن ہے کہ یہاں مولانا عثمانی صاحب اپنے سہوِ قلم کا عذر پیش کریں یا کاتبِ "البلاغ" کے سر اسے منڈھ دیں، لیکن راجع السنّہ میں السنّہ کا ترجمہ "پہلی سنّت" کرنا یا لکھنا بڑا معنی خیز ہے، کیونکہ اسی سے تو آپ نے وہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ پہلی سنت کے ساتھ یا اس کے بعد "دوسری سُنّت" بھی ہوتی ہے۔ حالانکہ صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ السنّہ سے مراد ایک ہی سُنّتِ ثابتہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اور خلفائے راشدین کی سُنّت ہے، اس کے مقابلے میں کوئی دوسری چیز جسے آپ "دوسری سُنّت" کہتے ہیں، وہ وہ سنت نہیں جو کتاب اللّٰہ کے ساتھ حجت ثانیہ ہو۔ وہ سنت ہے تو بنو امیہ ہی کی سنت ہے (باستثنائے حضرت عثمانؓ و عمرؒ ثانی)۔ کیا آپ یہ نہیں دیکھتے کہ اس مقام پر البدایہ میں لامِ تعریف کے ساتھ السنّہ ہی کا لفظ آیا ہے، اس لیے یہاں پہلی کے بعد دوسری سُنّت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور دوسرا مقام جہاں البدایہ میں السنة الاولی کا لفظ آیا ہے، وہاں بھی السنة الأخرىٰ کا لفظ موجود نہیں، بلکہ وہاں آگے یہ الفاظ ہیں: فلما قام هشام اخذ بسنة الخلفاء جس کا ترجمہ آپ نے بھی یہی کیا ہے کہ "جب ہشام آیا تو اس نے خلفاء کی سُنّت پر عمل کیا"۔ ان خلفاء سے مراد ہرگز خلفائے راشدین نہیں کیونکہ ان کی سنت کو تو امیر معاویہؓ نے بدل دیا۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی شک باقی رہتا ہے کہ جس شے کو آپ دوسری سُنّت کہہ رہے ہیں، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم یا خلفائے اربعہ کی سنت نہیں، بلکہ خلفائے بنی امیّہ کی ہے اور جیسا کہ مَیں پہلے مضمون میں بتا چکا اور مثالیں دے چکا، ان خلفاء کی سُنّتیں تو بے شمار ہیں: اگر حمایت کرنی ہے تو پھر ان ساری "سنت ہائے ثانیہ" کی کیجیے اور دفاعِ سنت کا پُورا پُورا ثواب لیجیے۔

پھر مدیرِ "البلاغ" کے یہ الفاظ بھی عجیب ہیں کہ "مولانا نے "سُنّتِ اُولیٰ" کے لفظ کو "بدعت" سے کیوں بدلا؟ مولانا نے سُنّت یا سُنّتِ اُولیٰ کے الفاظ کو بدعت کے لفظ سے نہیں بدلا، بلکہ سُنّت کو لوٹا دینے کا مفہوم

ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ بدعت کو ختم کیا۔ مولانا عثمانی کے نزدیک ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے؛ حالانکہ دونوں میں کوئی فرق ہی نہیں سُنّت کا بحال کرنا اور بدعت کو ختم کرنا بالکل ہم معنی ہے اور بدعت کا خاتمہ کیے بغیر سنت لوٹ ہی نہیں سکتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا اپنا ارشاد مبارک ہے کہ سُنّت مٹتی ہے تو بدعت اس کی جگہ لیتی ہے، اِس لیے احیائے سُنّت کا مطلب بدعت کو ختم کرنے کے سوا اور کیا ہے؟ مدیرِ "البلاغ" کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ خود مولانا مودُودی صاحب نے جو حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو بدعت قرار دیا ہے[1]، وہ دُرست نہیں، اس لیے کہ یہ فقہی اجتہاد تھا جس کی بنیاد ایک مرفوع حدیث پر ہے۔ مَیں اس اعتراض کا نہایت مفصل و مدلّل جواب پہلے سلسلۂ مضامین میں دے چکا کہ یہ فعل نصوص کتاب و سُنّت اور تعاملِ خلافتِ راشدہ سے عین معارض و متصادم ہے، اس لیے یہ اجتہاد نہیں ہے اور جس حدیث کو اس کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے اس کا سرے سے وراثت سے کوئی تعلق ہی نہیں اور وہ دوسری احادیثِ صحیحہ کے مخالف ہے۔ اب میری ساری بحث سے صرفِ نظر کرتے ہوئے "البلاغ" نے پھر اپنی بات کو دُہرا دیا ہے کہ یہ دوسرا مسلک بھی بے بنیاد نہیں ہے اور یہ قیاس غلط ہے کہ حضرت معاویہؓ نے سیاسی اغراض کے لیے حلال و حرام کی تمیز روا نہیں رکھی۔ مَیں پھر کہتا ہوں کہ یہ بات مولانا مودُودی نے حضرت معاویہؓ کے متعلق نہیں کہی بلکہ دَورِ ملوکیت کے متعلق ایک عام بات کہی ہے اور عام و خاص میں بہر حال فرق ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ یہ حضرت معاویہؓ کا اجتہاد ہے، تو چلیے اسے اجتہاد ہی مان لیجیے۔ اگر امیر معاویہؓ اس اجتہاد پر ذاتی طور پر عمل فرما لیتے یا بطورِ اپنے انفرادی مسلک کے اسے دوسروں کے سامنے بیان کر دیتے تو اس میں کوئی مضایقہ نہ تھا۔ لیکن جملہ بحث و اشکال تو اس امر میں ہے کہ کیا ایسے انفرادی اجتہاد کا مکلّف و پابند دوسروں کو بھی بنایا جا سکتا ہے اور سنتِ ماضیہ کو ہٹا کر اسے قانونِ ملکی کے طور پر پوری اسلامی سلطنت میں نافذ کیا جا سکتا ہے؟ جبکہ یہ نصِ صریح سے ٹکرا رہا ہو؟ یہ تو اصولِ فقہ کا ایک عام مسئلہ ہے کہ جائز و مباح بلکہ مندوب تک کا لزوم و وجوب اسے بدعت کے دائرے میں داخل کر دیتا ہے۔

---

[1] گویا کہ یہاں عثمانی صاحب نے تسلیم کر لیا کہ مولانا مودُودی نے امام زُہری کی طرف یہ بات منسوب نہیں کی بلکہ خود اعادۂ سنت کو خاتمۂ بدعت سے تعبیر کیا، حالانکہ پہلا اعتراض یہ تھا کہ امام زُہری کی طرف وہ بات کیوں منسوب کی جو انہوں نے نہیں کہی تھی۔

**صحابۂ کرامؓ اور فقہاء کے تفردات** اس جگہ مدیر"البلاغ" نے بعض صحابۂ کرام کے تفردات گنواتے ہیں اور ان کو امیر معاویہؓ کے جوازِ مسلک کے طور پر پیش کیا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں کہ" ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا یہ مسلک مشہور و معروف ہے کہ وہ ایک دن کی روزی سے زیادہ رقم اپنے پاس رکھنا حرام سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ مسلک قرآن وسنّت کے واضح دلائل کے خلاف ہے۔ اسی وجہ سے صحابۂ کرامؓ میں سے کوئی ایک بھی اس میں ان کا ہمنوا نہ تھا۔ سب کے نزدیک ان سے اس مسئلے میں اجتہادی غلطی ہوئی تھی"۔ اچھا، اب فرض کیجیے کہ حضرت ابوذرؓ مسندِ اقتدار پر فائز ہو جاتے اور وہ اپنے اسی مسلک کو پوری مملکتِ اسلامیہ میں قانوناً نافذ کر دیتے کہ کوئی شخص ایک دن کی روزی سے زاید اپنے پاس نہ رکھے کیونکہ یہ ان کے نزدیک حرام ہے۔ اب مجھے مولانا عثمانی صاحب بتائیں کہ وہ اس مسلک کے رواج و نفاذ کی اسی زور کے ساتھ تائید کریں گے یا نہیں جس طرح وہ امیر معاویہؓ کے مسلک کی کر رہے ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ امیر معاویہؓ کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ"جب وہ امیر بن گئے، تب بھی ان کی اہلیتِ اجتہاد ختم نہیں ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی فقیہ مجتہد امیر بن جائے تو اسے محض امیر ہونے کے جرم میں اجتہاد سے محروم تو نہیں کیا جا سکتا"۔ اگر امیر معاویہؓ کے بارے میں یہ امر ظاہر ہے تو پھر حضرت ابوذرؓ اور دوسرے سب صحابۂ کرامؓ کے معاملے میں بھی ظاہر ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ کے جو فضائل و مناقب ہیں اور جنہیں" البلاغ" میں بیان کیا گیا ہے، حضرت ابوذرؓ کے فضائل اس سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ پھر وہ بھی اپنے مسلک کے حق میں آیات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ارشادات پیش کرتے تھے جو ان روایات سے زیادہ صحت کے ساتھ مروی ہیں جو امیر معاویہؓ کے حق میں پیش کی جاتی ہیں اور حضرت ابوذرؓ کے استنباط و اجتہاد میں تکلّف یا خطا اس سے زیادہ نہیں ہے جتنا کہ حضرت معاویہؓ کے حق میں پیش کیے جانے والے اجتہاد میں ہے۔

مدیر"البلاغ" نے شروعِ مضمون ہی میں یہ شکایت بھی کی ہے کہ" بعض جوشیلے حضرات نے ہمیں سوشلسٹ تک قرار دیا"۔ معلوم نہیں یہ حضرات کون تھے اور اس تازہ نمبر کی اشاعت سے پہلے انہوں نے کس بنیاد پر ایسا بے بنیاد الزام تراشا، لیکن کچھ جوشیلے یا پھر ہوشیار قسم کے حضرات اگر امیر معاویہؓ کے حق میں دیئے جانے والے "البلاغ" کے سارے دلائل کو حضرت ابوذرؓ کے فقہی مسلک اور اس کے بعد پھر سوشلزم کے حق میں استعمال

کرنے لگیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مدیرؔ "البلاغ" کیوں اس پر شاکی ہوں؟ پھر یہ بات بھی عجیب ہے کہ آپ کو تو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ "حضرت ابوذرؓ کا مسلک قرآن و سنت کے واضح دلائل کے خلاف ہے" مگر دوسرا شخص یہی بات حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں کہہ دے تو یہ سبّ و شتم ہے۔

اس کے بعد مدیرؔ "البلاغ" امام شافعیؒ کا یہ مسلک بیان کرتے ہیں کہ "وہ اس کے قائل ہیں کہ اگر کوئی ذبیحہ پر بسم اللہ پڑھنا جان بوجھ کر چھوڑ دے، تب بھی ذبیحہ حلال ہوتا ہے" اور پھر پوچھتے ہیں کہ "کیا کسی نے اس مسلک کی وجہ سے امام شافعی پر بدعت کا الزام عائد کیا ہے"؟ یہاں پھر میں بھی پوچھتا ہوں کہ اگر امام شافعیؒ امیر المومنین ہوتے اور وہ اسی مسلک کو پوری امت میں قانوناً نافذ کر دیتے تو کیا یہ بدعت کی تعریف میں نہ آتا؟ یہ سوال میں صرف "البلاغ" کے استدلال کی غلطی اور خامی واضح کرنے کے لیے کر رہا ہوں، ورنہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کسی فقیہ یا مجتہد نے یہ کبھی نہیں چاہا کہ اس کا کوئی انفرادی مسلک دوسروں پر جبراً یا بذریعۂ اقتدار نافذ العمل ہو۔ امام مالکؒ کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ہارون الرشید نے ان کے مؤطا کو قانون ملکی کی اساس بنانے کا ارادہ کیا تھا مگر امام مالکؒ نے اس تجویز کو سختی سے رد کر دیا تھا۔ سلاطینِ متاخرین میں سے بھی بہت سے شافعی المسلک تھے لیکن انہوں نے اپنی سلطنت میں یہ قانون یا قاعدہ کبھی رائج نہیں کیا کہ جو شخص دانستہ ذبیحہ پر بسم اللہ نہ پڑھے، اس کا ذبیحہ ہر دوسرے شخص کے لیے حلال ہے۔ اسی طرح اگر حضرت امیر معاویہؓ خلیفہ بننے پر توریث مسلم من الکافر کو قانون نہ بناتے اور اپنے انفرادی اجتہاد کی حیثیت میں اس کے قائل رہتے، تو اس کا شمار بدعت میں نہ ہوتا۔ حضرت عمرؓ خلیفہ ہونے سے قبل اور بعد میں بھی اس مسلک پر تھے کہ جُنُبی جب تک پانی سے طہارتِ غسل نہ کر لے، وہ تیمم سے نماز کسی عذر کی بنا پر نہیں پڑھ سکتا۔ خلافت پر فائز ہونے کے بعد ان کا حضرت عمار بن یاسر سے اس مسئلے میں مذاکرہ و مباحثہ بھی ہوا، اس کے باوجود وہ اپنے ذاتی مسلک پر قائم رہے، مگر انہوں نے حضرت عمارؓ یا کسی دوسرے مسلمان پر اپنے مسلک کی پیروی لازم نہ کی۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے عہد میں شوریٰ کا نظام پوری طرح قائم و کارفرما تھا اور بالعموم اہم ملکی و اجتماعی مسائل باہمی مشاورت کے بعد طے ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے اجماع کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنتِ خلفاء راشدین کا نام دے کر یا دوسرے لفظوں میں اسے اپنی سنت کا ضمیمہ و تتمہ قرار دے کر اس

کی پیروی کا بھی حکم دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا عام طریقہ یہی یہ تھا کہ پیش آمدہ مسائل میں نہ صرف شوریٰ سے مشورہ لیتے تھے، بلکہ یہ اعلانِ عام کرتے تھے کہ فلاں مسئلے میں اگر کسی کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی کوئی قولی و فعلی حدیث ہو تو آکر ہمیں بتائے، اس لیئے اس عہدِ سعادت میں اس امر کا امکان بہت کم تھا کہ خلفاء کسی اپنے انفرادی مسلک کا نفاذ عام کرتے۔ بعد کے ادوار میں یہ صورت باقی نہ رہی اور ایسے فیصلے نافذ العمل ہوئے جنھیں اب خواہ مخواہ سُنّت کا درجہ دینے کی کوشش کی جارہی ہے اور کہا جارہا ہے کہ یہ پہلی سُنّت نہ سہی "دوسری سُنّت" تو ہے، حالانکہ جس حدیث میں ارشادِ نبویؐ علیکم بسُنّتی و سُنّۃ الخلفاء الراشدین وارد ہے، اُسی میں آگے وایّاکم ومحدثات الامور مروی ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جو فیصلہ سنتِ نبوی اور سنتِ خلفاء راشدین کے خلاف ہوگا، وہ محدثات کے زمرے میں آئے گا اور جس طرح سنت سے تمسک کی تاکید فرمائی گئی، اسی طرح محدثات سے بچنے کی بھی تاکید فرمائی۔

امام شافعیؒ کے ذکر کے بعد مدیرِ "البلاغ" نے "الاعتصام" (للشاطبیؒ) کی عبارت نقل کی ہے جس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ بدعت کا اطلاق اس فعل پر ہوتا ہے جس میں خواہشِ نفسانی کی اتباع میں تحریفِ دین کا ارتکاب کیا جائے۔ حالانکہ امام شاطبیؒ نے بدعت کی اصل تعریف میں ہر اس رائے کو داخل کیا ہے جو کسی اصل شرعی پر مبنی نہ ہو، البتہ اگر جہل و اتباعِ ہوٰی بھی اس کے ساتھ شامل ہو، تو وہ بدعتِ مذمومہ قرار پاتی ہے۔ میں نے امیر معاویہؓ کے فیصلے کو دوسری سنت قرار دیئے جانے پر جو لکھا تھا کہ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے آج کل فضل الرحمٰن اور پرویز صاحب جیسے لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا ہر امیر یا مرکزِ ملت جو کچھ طے کر دے وہی سُنّت ہے، اس کے جواب میں مولانا محمد تقی صاحب فرماتے ہیں کہ بات تو یہ کہی جارہی ہے کہ امیر معاویہؓ کو اجتہاد کا حق حاصل ہے اور امیر ہو جانے کے بعد بھی یہ حق سلب نہیں ہو سکتا۔ میں اوپر اس معارضے کو صاف کر چکا کہ سوال مطلق حقِ اجتہاد کا نہیں بلکہ ایسے اجتہاد کو پوری امتِ اسلامیہ پہ قانوناً نافذ کر دینے کا ہے جو کسی شرعی اصل پر مبنی نہیں۔ اگر فضل الرحمٰن صاحب یا پرویز صاحب کے مرکزِ ملت کا ذکر اُلجھن کا باعث ہے تو میں محمود احمد عباسی صاحب کی مثال پیش کرتا ہوں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ توریث اور دیت کا قاعدہ جب مدتِ مدید تک خلفائے بنی امیہ نے پوری مملکت میں قانونِ ملکی کی حیثیت سے نافذ و جاری رکھا تو پھر یہ

بلاشک و شبہ سُنّت ہے، اس کے سُنّت ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے؟ کیا مولانا عثمانی صاحب اس استدلال سے متفق ہیں؟

**امیر معاویہؓ کے فیصلے پر "قضیۃ محدثۃ" کا اطلاق** حیرت ہے کہ البلاغ میں پھر مجھ سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ میں اس کی کوئی مثال پیش کروں کہ کسی نے امیر معاویہؓ کے اس فعل کو بدعت قرار دیا ہو اور مدیر البلاغ فرماتے ہیں کہ "چودہ سو سال کے عرصے میں کوئی ایک فقیہ ہماری نظر سے نہیں گزرا جس نے اسے بدعت قرار دیا ہو"۔ میں اپنی سابق بحث میں متعدد قدیم و جدید اہل علم کے اقوال نقل کر چکا ہوں جنہوں نے امیر معاویہؓ کے مختلف اعمال کے لیے بدعت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مَیں نے ترجمان القرآن ربیع الاول ۱۳۹۰ھ میں احناف کے مشہور محدث و فقیہ ابوبکر الجصّاص کی کتاب "احکام القرآن" کے ایک مفصّل قول کا حوالہ دیا ہے جس میں حضرت مسروقؒ تابعی نے حضرت معاویہؓ کے اس فیصلہ توریث پر بڑے سخت انداز میں تنقید کی ہے اور قاضی شُریح نے اور خود الجصّاص نے بھی اس تنقید کی تائید کی ہے۔ مَیں نے وہاں اس بحث کے کچھ عربی حصّے معہ ترجمہ نقل کیے تھے اور بقیہ کا خلاصہ بیان کر دیا تھا۔ اب اگر میں دوبارہ پُوری عبارت کو ترجمے کے ساتھ نقل کروں تب تو یہ بہت موجب طوالت ہوگا، اس لیے مَیں یہاں اس کا صرف اردو ترجمہ دیتا ہوں:

"ابنِ شہاب زہریؒ داؤد سے اور وہ مسروق سے راوی ہیں کہ مسروق نے فرمایا کہ اسلام میں اس سے زیادہ عجیب اور نرالا فیصلہ نہیں کیا گیا جیسا کہ امیر معاویہ نے کیا (ما احدث فی الاسلام قضیۃ اعجب من قضیۃ قضاھا معاویۃ) کہ آپ مسلمان کو یہودی اور نصرانی کا وارث قرار دیتے تھے اور یہودی و نصرانی کو مسلمان کا وارث نہیں بناتے تھے۔ اہلِ شام نے اسی کے مطابق فیصلے کیے۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو آپ نے پہلے طریقے کو دوبارہ لوٹا دیا۔ اور شعبی سے روایت ہے کہ امیر معاویہؓ نے زیاد کو تحریر کیا کہ وہ مسلمان کو کافر کا وارث بنائے۔ زیاد نے قاضی شُریح کو بلا کر ایسا کرنے کا حکم دیا۔ شُریح اس سے پہلے مسلمان کو کافر کا وارث نہیں بناتے تھے۔ جب زیاد نے ایسا حکم دے دیا تو انھوں نے اس کے مطابق فیصلہ کیا مگر جب وہ ایسا فیصلہ کرتے تھے تو فرماتے تھے کہ یہ امیر المومنین کا فیصلہ ہے حالانکہ زہری علی بن حسین سے، وہ

عمرو بن عثمان سے اور وہ حضرت اُسامہؓ بن زید سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "دو مختلف ملتوں کے افراد ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے" اور دوسری روایت میں ہے کہ "مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا اور نہ کافر مسلمان کا"۔ اور عمرو بن شعیب، اپنے والد سے اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ دو مذاہب کے پیروؤں میں باہمی توارث نہیں ہو سکتا۔ یہ روایات مسلمان کو کافر کا یا کافر کو مسلمان کا وارث قرار دینے سے منع کرتی ہیں۔ اس کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے مروی نہیں ہے۔ پس اس طرح دو اہل مذہب کے مابین توارث ساقط ہونے کا حکم ثابت ہو گیا۔ جہاں تک حضرت معاذؓ والی روایت کا تعلق ہے وہ امیر معاویہؓ کے اس قول کی تائید نہیں کرتی۔ انہوں نے الایمان یزید ولا ینقص کی صرف ایک تاویل کی ہے اور تاویل نص اور توقیفِ وحی پر قاضی نہیں ہو سکتی۔ تاویل کو امرِ منصوص کی طرف لوٹایا جائے گا اور نص کی مخالفت پر نہیں بلکہ اس کی موافقت پر محمول کیا جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ ارشاد کہ "ایمان بڑھتا ہے، گھٹتا نہیں" اس مراد پر محتمل ہو گا کہ جو اسلام لے آیا اُسے اسلام پر رہنے دیا جائے گا اور جو اسلام سے خارج ہو گا اُسے واپس لانے کی کوشش کی جائے گی۔ اگر حضرت معاذ کی تاویل اور اس احتمال کو لیا جائے تو اسے حضرت اُسامہؓ کی اس حدیث کے موافق کرنا واجب ہو جاتا ہے جس میں کافر و مسلم کے مابین توارث ممنوع ہے کیونکہ تاویل و احتمال کے بل پر نص کو رد کرنا جائز نہیں، اور احتمال کے ذریعے سے کوئی حجت قائم نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ ایک مشکوک چیز ہے اور اثبات حکم کے معاملے میں خود دلالت کی محتاج ہے۔ پس اس سے احتجاج و استدلال ساقط ہو گیا۔

اور مسروق کا جو یہ قول ہے کہ اسلام میں اس سے زیادہ انوکھا فیصلہ نہیں ہوا جو امیر معاویہؓ نے توریثِ مسلم من الکافر کے مسئلے میں کیا ہے، یہ قول اس فیصلے کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ فیصلہ احداث فی الاسلام ہے اور ان کے اس قول سے یہ لازم آتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فیصلے سے پہلے مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا تھا اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ امیر معاویہؓ کے فیصلے سے پہلے مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا تھا تو ان کے

لیے یہ جائز نہیں تھا کہ وہ اپنے پیش رووں کی مخالفت کریں۔ بلکہ ان کے سامنے حضرت معاویہؓ کا قول ساقط ہے اور اس کی تائید داؤد بن ابی ہند کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے لوگوں میں امر اول کو لوٹا دیا"۔ (احکام القرآن، ابوبکر احمد بن علی الجصاص، ج ۲، ص ۱۲۳، المطبعۃ البہیہ مصر، ۱۳۴۷ھ)

ممکن ہے کہ یہاں مدیر "البلاغ" پھر یہی فرمائیں کہ یہاں بدعت کا لفظ نہیں آیا، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے کہ کل محدثۃ بدعۃ (ہر امر محدث بدعت ہے)، نیز آنحضورؐ نے فرمایا: شر الامور محدثاتھا (سب سے برے امور محدثات ہیں)۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا: من احدث فی امرنا ما لیس منہ فھو رد (جس نے امر دین میں نئی بات نکالی جو اس میں نہیں، وہ بات مردود ہے)۔

ابن قدامہ کا قول | آخر میں "البلاغ" میں میرے "ایک اور مغالطے اور بوالعجبی" کی نشان دہی کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ میں نے المغنی ج ۶، ص ۱۶۶ کے حوالے سے لکھا تھا کہ "ابن قدامہؒ پہلے یہ بیان کرتے ہیں کہ محمد بن حنفیہ، علی بن حسین، سعید بن المسیب، مسروق، عبداللہ بن معقل، شعبی، ابراہیم نخعی، یحییٰ بن یعمر اور اسحاق کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلم کو کافر کا وارث قرار دیا۔ اس کے بعد ابن قدامہ فرماتے ہیں کہ اس کی نسبت ان کی جانب قابل اعتماد نہیں ہے۔" مولانا عثمانی صاحب فرماتے ہیں "اس سے پہلے ابن قدامہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت معاذؓ اور حضرت معاویہؓ سے یہ قول مروی ہے کہ انہوں نے مسلمان کو کافر کا وارث بنایا۔ اب اگر دوسرے حضرات کی جانب اس قول کی نسبت مشکوک ہے تو ان تینوں اصحاب کی جانب بھی غیر موثوق ہونی چاہیے کیونکہ ابن قدامہ نے سب کے بارے میں یہ کہا ہے کہ لیس بموثوق بہ عنہم عثمانی صاحب کے نزدیک میں نے یہ مغالطہ اس لیے پیدا کیا ہے کہ مولانا مودودی نے جو امیر معاویہؓ کو بدعت کا مرتکب بتایا ہے، اس کی تصدیق کی راہ ہموار ہو سکے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مولانا مودودی نے یہاں "بدعت" کا لفظ "غیر مسنون و غیر مشروع" کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور ان معنوں میں اس فعل کے بدعت ہونے، نہ ہونے یا اس کی نسبت کے موثق و غیر موثق ہونے کا انحصار صرف المغنی کی اس عبارت پر نہ تھا کہ میں یہاں مغالطہ انگیزی ضروری سمجھتا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ پہلے ابن قدامہ نے ایک جملہ الگ روی ... سے شروع کیا ہے، پھر انہوں نے حُکی سے دوسرا جملہ شروع کیا ہے۔ ان کا تعلق متصلاً ولیس بموثوق بہ عنہم لکھا ہے۔ اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ولیس کا عطف حُکی پر ہے کیونکہ یہی جملہ

ان دونوں جملوں کو مطبوعہ کتاب میں وقف تام (۔) کے ذریعے سے ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ بھی کر دیا گیا ہے۔

قریب تر ہے، اسی طرح عنہم کا مرجع بھی اسی قریب کے جملے میں ہے اور ولیس بموثوق بہ عنہم کا تعلق دوسرے ہی جملے سے ہے۔ تاہم مجھے اپنی بات پر اصرار نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس جملے کا ربط دونوں پہلے جملوں سے ہو اور ابن قدامہ کی مراد یہی ہو کہ ان سارے حضرات کی جانب اس مسلک کی نسبت مشکوک ہے۔ اگر فی الواقع اس معنی میں یہ بات صحیح ہوتی تو میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہ تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذؓ کے متعلق یہ قول اس کثرت سے حدیث، آثار، تاریخ اور فقہ کی کتابوں میں مذکور رہے کہ محض ابن قدامہ کے ایک ذو معنی فقرے کے بل پر ان ساری کتابوں میں مروی اقوال کی تکذیب نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک حضرت معاذؓ کا تعلق ہے میں پھر بھی کہوں گا کہ یہ ان کا ذاتی نظریہ ہو گا اور ممکن ہے انہوں نے کسی موقعہ پر اس کے مطابق عمل کیا ہو، لیکن امیر معاویہؓ نے امیر المومنین کی حیثیت سے جس طرح اس کا نفاذ و اجرا کیا اور بنو امیہ کے دور میں جس طرح یہ رائج رہا، وہ اس واقعہ کی صحت کو شک و شبہ سے بالاتر بنا دیتا ہے اور اس میں اعتراض کا پہلو بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مدیرؔ "البلاغ" نے یہ بھی کہا ہے کہ ابن قدامہؒ نے دلیل میں امام احمدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ "لوگوں کے درمیان اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں" جس سے واضح ہے کہ توریث والے اس قول کی نسبت کسی کی طرف بھی درست نہیں"۔ مگر یہاں خود مدیر موصوف کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ صاحب المغنی نے امام احمدؒ کا جو قول نقل کیا ہے اس کا مدعا یہ ہے کہ مسلمان کو کافر کا وارث بنانے والا نظریہ و عمل اب امت میں متروک و مطرود ہو چکا ہے اور کوئی عالم و فقیہ اب اس کا قائل و عامل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اس بحث کا عنوان یہ ہے: "ولا یرث مسلم کافراً ولا کافر مسلماً۔

چند مزید اقوال | جہاں تک امیر معاویہؓ کے اس فیصلے اور فرمان کا تعلق ہے کہ "مسلمان کو کافر کا وارث بنایا جائے"، سب نے امیر معاویہؓ سے اس کا صادر ہونا تسلیم کیا ہے۔ مثال کے طور پر امام ابن حزم نے بھی المحلّٰی، ج ۹ ص ۳۰۴ پر مسئلہ ۱۷۳۴ کے تحت پہلے عنوان یہی قائم کیا ہے کہ: لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم المرتد، پھر معاذ بن جبلؓ اور بعض دوسرے حضرات کی طرف یہ مسلک منسوب کیا ہے کہ ان کے نزدیک مسلمان کافر کا وارث ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد خاص طور پر امیر معاویہؓ کے متعلق لکھتے ہیں کہ ھو عن معاویۃ

ثابت (یہ مسلک امیر معاویہؓ سے ثابت ہے)۔ ابن حزمؒ کی فقہی آراء سے کسی کو اختلاف ہو تو ہو، مگر حدیث و آثار میں ان کی تحقیق مسلم ہے۔ ان کا دوبارہ خاص طور پر یہ کہنا کہ ھو ثابت عن معاویۃ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس فیصلے کی نسبت امیر معاویہؓ کی طرف قطعی طور پر غیر مشتبہ ہے۔ داؤد ابن ابی ہند اور مسروق کے اس مضمون کے اقوال جو اوپر امام ابوبکر جصاصؒ کی بحث میں بھی گزر چکے ہیں وہ ابن حزم نے بھی نقل کیے ہیں اس کے بعد وہ امام احمدؒ کا وہی قول نقل کرتے ہیں جو ابن قدامہ نے درج کیا ہے اور آخر میں ابن حزم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مزید حدیث حضرت جابرؓ سے نقل کی ہے کہ لا یرث المسلم النصرانی (مسلمان کسی عیسائی کا وارث نہیں ہو سکتا)۔

الجصاصؒ اور ابن حزمؒ کے بعد اب میں ملا علی قاریؒ کی مرقاۃ شرح مشکوٰۃ کا ایک حوالہ پیش کرتا ہوں۔ ابواب الفرائض میں حدیث وعن اسامۃ بن زید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم (متفق علیہ) کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو حضرات مسلمان کی کافر سے توریث کے قائل ہیں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں کہ الاسلام یعلو و لا یُعلیٰ۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| وحجۃ الجمھور ھذا الحدیث الصحیح والمراد من حدیث الاسلام فضل الاسلام علی غیرہ ولیس فیہ تعرض للمیراث فلا یترک النص الصریح ۔ | مسلکِ جمہورؒ کے حق میں وہی حدیث صحیح حجت ہے (کہ نہ مسلمان کافر کا وارث ہے، نہ کافر مسلمان کا) اور حدیث: الاسلام یعلو ولا یُعلیٰ سے مراد اسلام کی غیر اسلام پر فضیلت ہے۔ اِس دوسری حدیث کا میراث سے کوئی تعلق نہیں پس نصِ صریح کا ترک جائز نہیں۔ |

ربیع الاول ۱۳۹۰ھ کے ترجمان میں فتح الباری سے میں ابن حجرؒ کا قول نقل کر چکا ہوں جو اسی مفہوم کا حامل ہے اور جس میں مسلمان کو کافر کا وارث بنانے کو معارضۃ النص سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس کے حق میں پیش کی جانے والی روایت کے بارے میں فرمایا ہے: بل ھو محمول انہ یفضل غیرہ من الادیان ولا تعلق لہ بالارث (اس حدیث کا وراثت کے مسئلے سے کوئی علاقہ نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ

اسلام دوسرے ادیان پر فضیلت رکھتا ہے)۔ یہ بات بھی میں پہلے لکھ چکا کہ یہاں سوال حضرت امیر معاویہؓ یا کسی دوسرے صحابی یا تابعی کی ذات کا نہیں اور اس امر کا بھی نہیں کہ توریث مسلم من الکافر کے قائل یا فاعل کون بزرگ ہیں اور ان کی تعداد کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ نصِ صریح کا ترک اور اس کی مخالفت و معارضت ہے جیسا کہ حافظ ابنِ حجرؒ اور محدّث علی انصاری نے فرمایا۔ نص صریح سے مراد نصِ قرآنی بھی ہے اور نصِ حدیث و سنت بھی ہے اس کے بعد جس کا جی چاہے اسے اجتہاد یا دوسری سنت کہہ کر اس کی تائید میں زور لگاتا رہے۔ جیسا کہ مدیر "البلاغ" نے فرمایا ہے، ظاہر ہے کہ نظریات کے معاملے میں جبر نہیں کیا جا سکتا۔

(باقی)

---

## (بقیہ مطبوعات)

لیے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کی ہیں۔ کتاب بڑی فکر انگیز ہے اور اس کی موجودہ حالات میں اشاعت ضروری ہے۔ طباعت و کتابت کا معیار اگر اس سے بہتر ہوتا تو یہ مناسب تھا۔

---